یوسف زلیخا

مرزا ادیب

اگر کسی دھات کی گھنٹی کو کچھ مدت کے لیے ایک ایسی جگہ پر رکھ دیا جائے جہاں صبح وشام اس پر گرد جمتی رہے اور ہوا کے جھونکے اس سے بار بار ٹکراتے رہیں تو جب اسے بجانے کی کوشش کی جائے گی، اس میں سے ایک تیز، مترنم ٹنن کی بجائے ایک بھاری سی چیخ برآمد ہوگی اور وہ آواز بھی اس بھاری سی چیخ سے کچھ مختلف نہیں ہوتی تھی جو کبھی تو ہر روز اور کبھی دو ایک روز کے وقفے کے بعد لالہ دُنی چند عطار کی دکان سے نکل کر فضا میں گونجنے لگتی تھی۔

لالہ دنی چند پیشے کے لحاظ سے عطار تھا جو محلے کے لوگوں کو گنتی کے دو چار شربت اور کھانسی بخار دور کرنے کی پڑیاں دیا کرتا تھا مگر جاننے والے اسے عطار کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے اور اگر جانتے بھی تھے تو اس کی اہمیت بہت معمولی تھی۔ لالہ دنی چند مولوی غلام رسول کی شہرہ آفاق تصنیف "یوسف زلیخا" بڑی دردمندی اور ہنرمندی سے پڑھتا تھا اور اس کی یہی خوبی اسے اپنے محلے اور گردونواح کے لوگوں میں ہر دلعزیز بنانے کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اسے وہ عزت وتکریم حاصل ہو چکی تھی۔ جو چوک دیوی دتا کے بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی تھی۔

لالہ دنی چند کو میں بچپن سے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ اس کی دکان سِدّے بازار کی قدیم ترین دکان تھی یا دو تین قدیم ترین دکانوں میں سے تھی۔ وہ صبح سویرے دکان کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔ دو تین گھنٹوں میں جتنی آمدنی ہو جاتی تھی اس پر اکتفا کر لیتا تھا۔ اس کے بعد اول تو گاہک ہی اس کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی ادھر آ بھی نکلتا تھا تو لالہ سودا دینے میں بڑی بیزاری کا اظہار کرتا تھا۔ چنانچہ لوگ اس کی دکان پر آنے سے اجتناب ہی کرتے تھے۔ شربت وغیرہ بازار حکیماں کے پاس چنن دین یا گلی پھلیریاں کی نکڑ والی دکان سے خرید لیتے تھے۔

لالہ ایک فربہ اندام بے ڈول آدمی تھا۔ سفید چہرہ لیکن اس چہرے اور اس کے جسم کے باقی حصے

کا پانی سے مہینوں بعد کہیں جا کر رابطہ قائم ہوتا تھا۔ اور وہ بھی میاں دین محمد کے اصرار پر اس لیے میل کی موٹی تہہ اس کے بدن کے ہر نظر آنے والے عضو پر جمی ہوئی دکھائی دیتی رہتی تھی۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ اس کا لباس بھی اس کے جسم سے پوری پوری مطابقت رکھتا تھا اور یہ لباس ہوتا بھی کیا تھا۔ ایک لمبا کرتہ کھدر کا اور کھدر ہی کی دھوتی۔ ان دونوں کا رنگ پہچاننا بہت مشکل تھا۔ عیسی درزی نے اسے اپنی طرف سے بطور تحفے کے پورا سوٹ سی کر دے دیا تھا لیکن لالہ ان دونوں کو الگ الگ انداز میں استعمال کرتا تھا۔ دھوتی تو اس نے دکان سے ملحقہ تھڑے پر بچھادی تھی کہ جو لوگ اس سے ''یوسف زلیخا'' سننے کے لئے آتے ہیں وہ گرد جمی جگہ پر نہ بیٹھیں اور کرتے کو دھوپ میں پھیلا کر وہ اس پر جڑی بوٹیاں سکھایا کرتا تھا جنہیں پیس کر کھانسی یا قبض وغیرہ کے مریضوں کو دیا کرتا تھا۔

عام طور پر ایک پڑیا کے دو پیسے وصول کرتا تھا اور ایک وقت میں تین پڑیوں سے زیادہ نہیں دیتا تھا۔ مریض کے گلاس میں دو پیسے یا زیادہ سے زیادہ ایک آنے کا صندل کا شربت ڈال دیتا تھا۔ برف کا اس زمانے میں کچھ زیادہ رواج نہیں تھا۔ ہندو، مسلمان گھڑوں کا پانی پیتے تھے اور یہی پانی شربت میں ڈال لیا کرتے تھے۔

ایک ہندو اور ''یوسف زلیخا'' کے قصے سے اتنی دلچسپی اور پھر ''یوسف زلیخا'' پڑھتے وقت اس کی آواز میں اتنا سوز، اتنی دردمندی کیسے آجاتی تھی۔ اس سوال پر عموماً وہ لوگ حیران ہوا کرتے تھے جو خود لالہ کی آواز نہیں سنتے تھے۔ صرف اپنے احباب یا عزیزوں سے اس آواز کی تعریف سنتے تھے اور جب وہ لالہ کی دکان کے تھڑے پر بیٹھ کر یہ آواز سن لیتے تھے تو پھر کبھی انہیں اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

یہ ''یوسف زلیخا'' کی کتاب جسے لالہ بڑی احتیاط کے ساتھ محفوظ کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ غالباً اس کے اوّلین ایڈیشن کی کاپی تھی جو وہ کسی زمانے میں بازار سے خرید لایا تھا۔ اس کے نسخے کا ایک ایک ورق جلد سے الگ ہو چکا تھا مگر وہ تھا کہ ان بوسیدہ پھٹے ہوئے اوراق کو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے جمائے رکھتا تھا۔ کتاب پر جلد اس نے سالہا سال پہلے بندھوائی تھی اب وہ مکمل طور پر ناکارہ ہو چکی تھی اور اوراق کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی تھی، پر لالہ کو یہ اوراق جس طرح عزیز تھے اسی طرح یہ ٹوٹی پھوٹی جلد بھی عزیز تھی۔ ایک زمانے میں جب کتاب کی حالت قدرے بہتر اور

قابل علاج تھی۔ میاں دین محمد نے لالہ سے کہا تھا کہ کتاب دو ایک روز کے لیے مجھے دے دو، نئی جلد بندھوادوں گا۔ لالہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ وہ اپنے پھٹے پرانے نسخے کو اتنی مختصر سی مدت کے لیے بھی جدا نہیں کرتا تھا۔ اور جب کتاب ورق ورق ہو کر نا قابل علاج ہوگئی تو کئی لوگوں نے اسے نئی کتاب خرید نے کی صلاح دی بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ نئی کتاب خود لا کر دے دیں گے۔ مگر لالہ کو یہ دونوں باتیں منظور نہیں تھیں۔

لالہ سے جب بھی کہا جاتا کہ اس کی کتاب ناکارہ ہو چکی ہے تو وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سینے پر رکھ دیتا اور یہ انگلی ایک منٹ تک اس کے سینے پر لگی رہتی گویا وہ بزبان خاموشی یہ جواب دیتا کہ کتاب ضائع نہیں ہوئی اس کے سینے کے اندر محفوظ ہوگئی ہے۔

لالہ کو اپنی ورق ورق کتاب سے کچھ ایسا جذباتی تعلق استوار ہوگیا تھا کہ وہ اسے حتی الامکان نگاہوں سے دور ہونے نہیں دیتا تھا۔ اس کے صبح کے دو تین گھنٹے بڑی مصروفیت کے ہوتے تھے اور میں نے دیکھا کہ وہ اس حالت میں بھی کتاب کو زانو پر جمائے رکھتا تھا اور اس کے اوپر ایک بڑا سا رومال ڈال دیتا تھا تاکہ جب کسی گاہک کے گلاس میں بوتل میں سے شربت ڈالے تو اس کے قطرے کتاب کی جلد کو آلودہ نہ کر دیں مگر یہ رومال خود اتنا گندہ ہو چکا تھا کہ جس شے سے بھی چھو جاتا تھا اسے متاثر کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔

میں لالہ کی زندگی کے اس حصے سے بالکل ناواقف تھا جسے وہ نہ جانے کہاں گزار کر ہمارے محلے میں آ گیا تھا۔ میں نے جب اسے دیکھا تھا بڑی مسجد کے متصل اس چھوٹی سی دکان میں بیٹھ کر شربت اور کھانسی، بخار کی پڑیاں بیچتے ہوئے ہی پایا تھا۔

اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ سردی یا گرمی شب و روز کے تھوڑے سے وقت کو چھوڑ کر جب وہ ضرورتاً باہر جاتا تھا اپنی دکان ہی میں دکھائی دیا کرتا تھا۔ سردیوں کی راتوں کو دکان کا دروازہ بند کر کے ایک میلی چٹائی پر لیٹ کر ایک برسوں پرانا لحاف اوڑھ لیتا تھا اور عام طور پر آدھی رات تک اس کی دھواں بھری لالٹین کی بڑی مدھم ضعیف روشنی دروازے کے نیچے سے باہر آ کر فرش کو گنڈیریوں کے چھلکوں کی طرح زردی مائل کر دیتی تھی۔ دکان کا دروازہ گھس گھسا کر اپنا نصف حصہ آدھ فٹ کے قریب کھو چکا تھا اس لیے لالٹین کی روشنی کو فرش تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ گرمیوں میں دکان کھلی رہتی تھی۔

لالٹین دروازے کے باہر آجاتی تھی اور وہ یوں لیٹ جاتا تھا کہ سوائے پاؤں کے اس کا سارا دھڑ دکان کے تھڑے پر رہتا تھا۔ اس حالت میں کتاب اس کی چھاتی کے اوپر یا سر کے نیچے بطور تکیے کے دکھائی دیا کرتی تھی۔ لالہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ جاننے والے جانتے تھے لالہ ''یوسف زلیخا'' سنانے میں بے مثل ہے۔ اس لیے لوگ دوپہر کو اس کے ہاں ''یوسف زلیخا'' سننے کے لیے آجاتے تھے۔ لالہ خوشی سے ہر شخص کا خیر مقدم کرتا تھا۔ کسی سے اس کا نام یا کوئی اور بات نہیں پوچھتا تھا۔ بس یہی ایک فقرہ کہتا تھا۔ ''جی آیاں نوں'' اور آنے والا خوش ہو کر جہاں بھی اسے جگہ ملتی تھی بیٹھ جاتا تھا۔

لالہ ''یوسف زلیخا'' تسلسل کے ساتھ نہیں سناتا تھا جو شخص پہلے آکر کہہ دیتا تھا۔

''لالہ جی! وہ سناؤ۔ وہ جی جس میں عورتیں یوسف کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ لیتی ہیں۔''

لالہ مسکراتا اور اس حصے کا طویل فارسی عنوان زبانی سنا دیتا اور سنا کر کہتا ''یہ سننا چاہتے ہو؟''

کہنے والا فارسی کا ایک لفظ سمجھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیتا اور لالہ چند لمحوں کے اندر اندر کتاب کا مطلوبہ حصہ سامنے رکھ کر شعر سنانے لگتا۔ اسے تہائی کتاب زبانی یاد تھی اور وہ اشعار جو سینکڑوں بار سنا چکا تھا انہیں سناتے وقت کسی قسم کی دقت محسوس نہیں کرتا تھا۔

ایک بار میں نے پوچھا:

''لالہ جی! آپ نے یوسف زلیخا کس سے پڑھی تھی؟''

کہنے لگا۔ ''دلاور! اللہ بخشے میرے استاد حاجی ابراہیم کو انہوں نے مجھے دو کتابیں پڑھائی تھیں۔ ایک کتاب مقبل کی ہیر، اور دوسری یہی احسن القصص۔''

''احسن القصص کون سی کتاب ہے؟'' اس زمانے میں مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ مولوی غلام رسول عالم پوری نے ''یوسف زلیخا'' کے قصے کو اس نام سے منظوم کیا تھا۔

میرے لفظ سن کر لالہ نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''سبحان اللہ تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کتاب ''یوسف زلیخا'' احسن القصص کہلاتی ہے۔''

لالہ نے ایک دفعہ ''یوسف زلیخا'' سے متاثر ہونے کا واقعہ سنایا تھا۔ وہ اپنی جوانی کے دنوں میں گوجرانوالہ میں بڑی بہن کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک رات باہر سے آئی ہوئی ایک تھیٹریکل کمپنی کا تماشا دیکھ کر گھر جا رہا تھا کہ ایک آواز نے اس پر جادو سا کر دیا۔ یہ آواز ایک دکان کے اندر سے آرہی تھی۔ وہ

دیر تک وہاں کھڑا رہا اور یہ آواز سنتا رہا۔ صبح وہ اس دکان پر گیا دکان دار جو ایک سبزی فروش تھا۔ اس نے لالہ کو بتایا کہ رات حاجی ابراہیم ''یوسف زلیخا'' سنا رہا تھا۔ وہ حاجی کا پتہ پوچھ کر اس کے گھر جا پہنچا۔ پہلی ملاقات میں کچھ نہ کہا۔ چند ملاقاتوں کے بعد حاجی سے ''یوسف زلیخا'' پڑھانے کی درخواست کی۔ حاجی نے یہ درخواست اس بنا پر رد کردی کہ ایک ہندو لڑکا ''یوسف زلیخا'' کیا پڑھے گا۔ مگر جب اس ہندو لڑکے نے حاجی صاحب کی منت سماجت کی اور چند روز ان کی پورے خلوص کے ساتھ خدمت بھی کی تو حاجی صاحب نے اس سے کہا کہ ہر شام کو سبزی فروش کی دکان پر آجایا کرو اور وہ اس روز سے جس روز اسے حاجی صاحب نے حاضری کا حکم دیا تھا۔ باقاعدگی کے ساتھ دکان پر جانے لگا۔ حاجی صاحب اس کے شوق اور دلچسپی سے بڑے متاثر ہوئے اور انہوں نے اسے ''احسن القصص'' پڑھانی شروع کردی۔ پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ حاجی صاحب دس بجے تک دکان میں بیٹھنے والے سامعین کو خود ''یوسف زلیخا'' سناتے اور جب تھک جاتے اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے تو لالہ ان کے سامنے دوزانو بیٹھ کر ایک آدھ گھنٹہ سبق پڑھتا اور پھر حاجی صاحب کو ان کے گھر پہنچا کر اپنی بہن کے یہاں چلا جاتا۔

لالہ کہا کرتا تھا:

''میرے مرحوم و مغفور استاد نے مجھے یہ کتاب اس طرح پڑھائی تھی جس طرح مولوی بچے کو قاعدہ پڑھاتا ہے۔''

اپنے استاد کا ذکر کرتے وقت لالہ سراپا عقیدت ہو جاتا تھا۔ حاجی ابراہیم کا نام اس نے ایک دو بار ہی ہونٹوں سے نکالا تھا۔ وہ عام طور پر استاد مرحوم و مغفور کہا کرتا تھا اور یہ الفاظ زبان سے نکالتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کانوں کی لویں چھو لیتا تھا اور کتاب کے اس پھٹے پرانے نسخے کو وہ اسی وجہ سے بہت عزیز سمجھتا تھا اور اس کی بجائے کوئی نیا نسخہ بازار سے خریدنے پر رضامند نہیں ہوتا تھا کہ یہ نسخہ اس نے اپنے استاد سے پڑھا تھا اور استاد کی انگلیوں نے بار بار اس کی سطروں کو چھوا تھا۔

محلے میں کہیں شادی بیاہ ہوتا تھا تو عام طور پر مہندی کی رات کو لالہ محلے کے کسی بزرگ کے کہنے پر بیاہ والے گھر میں چلا جاتا تھا اور دیر تک ''یوسف زلیخا'' سناتا رہتا تھا۔ اس محنت کے عوض اسے دو سے پانچ روپے مل جاتے تھے جو وہ نہ نہ کر کے آخر اپنی جیب میں ڈال لیتا تھا مگر اس رات میاں دین محمد کے اصرار پر بھی دتے راج کی لڑکی سرفراز کی شادی پر اس کے ہاں نہیں گیا تھا بلکہ اپنی دکان ہی

میں بیٹھا رہا تھا۔

میں چنے کی دال والی کھچڑی میں لازماً دہی ڈال کر کھاتا ہوں۔ یہ میرا من بھاتا کھاجا ہے اور اس شام میں ماجھے دودھ دہی والے سے دہی خریدنے ہی گیا تھا۔ کھچڑی گرم تھی، سوچا تھا جب تک دہی لاؤں گا ٹھنڈی ہو چکی ہوگی۔ ماجھے کی دکان لالہ کی دکان کے بالکل قریب تھی۔ میں نے دیکھا کہ لالہ کتاب کھولے ستار رنگریز کے منجھلے بیٹے بشیرے کو قصے کا وہ حصہ سنا رہا ہے جس میں زلیخا یوسف کے ہجر میں اپنے جذبات غم بصورت بارہ ماہ بیان کرتی ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو لالہ سنا رہا تھا۔

ہاڑ مہینے سر پر گزری دھپ وچھوڑے والی
سورج غم دے ہڈیاں مغزوں کر دکھلایاں خالی

شمس دو پیکر دے وچ سینے جیوں اج چمکاں مارے
ایویں زخم تیرا اج میرے سینے دے وچکارے

میں نے دیکھا کہ بشیرے کی آنکھیں اشک آلودہ ہیں۔ اس کے چہرے کی رنگت زردی مائل ہوگئی ہے اور وہ سر آگے بڑھا کر دونوں کہنیاں زمین پر ٹکائے ہلے جلے بغیر لالہ کے چہرے کو تکے جا رہا ہے۔

لالہ کتاب پڑھتے وقت زیادہ تر آنکھیں بند رکھتا تھا۔ کتاب کھول ضرور لیتا تھا مگر سناتا زبانی تھا اور اس وقت بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔

جب وہ پھگن پر پہنچا اور پہلا شعر سنانے لگا۔

پھگن ماہ فراقوں روندی پئے اکھیں وچ رو ہے
واد و عشق تیرے نے مینوں دکھ دتے سکھ کھو ہے

یہ شعر سنتے ہی بشیرے نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر اسے اتنا جھکا دیا کہ اس کی کہنیاں لالہ کے زانو کو چھونے لگیں۔ اس کی پیٹھ کانپ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ میں دہی

خریدنا بھول گیا تھا اور اب لالہ کی دکان کے سامنے کھڑا تھا۔

وہ دتے راج کی لڑکی سرفراز کی مہندی کی رات تھی۔ منڈے والے گھر سے منڈے کی بہنیں اور چند رشتہ دار عورتیں کڑی کو مہندی لگانے اس کے گھر جا رہی تھیں۔ ایک جوان لڑکی نے تھالی میں مہندی کے اوپر کئی موم بتیاں روشن کر رکھی تھیں اور رنگ و بو کا یہ قافلہ لالہ کی دکان کے آگے رواں دواں تھا۔ سب ادھر دیکھنے لگے۔ عورتیں گاتی ہوئی جا رہی تھیں۔ باقی آوازیں رک گئی تھیں۔ لالہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔

میں ادھر دیکھتا رہا اور جب عورتیں موڑ مڑ گئیں تو میں نے لالہ کی دکان کے اندر جھانکا۔ بشیرا نظر نہیں آ رہا تھا اور لالہ نے کتاب بند کر کے بوتلوں کے اوپر رکھ دی تھی۔

بشیرا کہاں چلا گیا تھا؟ یہ سوال نہ تو میں نے لالہ سے پوچھا اور نہ لالہ نے خود مجھے یہ بات بتانے کی ضرورت محسوس کی۔

صبح محلے میں ہر جگہ ایک دردناک خبر موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی اور خبر یہ تھی کہ رات بشیرے نے زہر کھا لیا تھا اور اس کے گھر والے خطرے کی حالت میں اسے ہسپتال لے گئے تھے۔ اور یہ خبر بھی سرگوشیوں کے عالم میں سنی جا رہی تھی کہ بشیرے کو سرفراز سے بڑا پیار تھا اور سرفراز گمٹی بازار کے گوٹہ کناری بیچنے والے امام دین سے بیاہی جا رہی تھی۔ اس صدمے پر بشیرے نے زہر کھا لیا تھا۔

بشیرے کی حالت لحہ بہ لحہ خراب ہوتی گئی اور دو دن کے بعد وہ مر گیا۔

اس المناک حادثے پر محلے کی حالت کچھ ایسی حالت ہو گئی تھی جیسے ایک چھوٹی سی انگیٹھی میں کوئلے اس طرح ٹھونس دیے جائیں کہ کڑوا کسیلا دھواں باہر نکلنے کے لیے کہیں بھی کوئی راستہ نہ پائے اور اندر ہی پھیلنے لگے۔ کوئی بھی کسی سے بات نہیں کرتا تھا لوگ چپ چاپ بوجھل دلوں اور بھاری قدموں کے ساتھ ادھر ادھر حرکت کر رہے تھے۔ اور پھر ایک دن شعلے نے کوئلوں میں سے گزر کر انگیٹھی کے باہر اپنا سر نکال لیا اور اس کے پیچھے پیچھے جگہ جگہ سرخی دھڑکنے لگی۔ واقعہ صرف یہ ہوا کہ بشیرے کے خالو نے اپنے صحن میں کھڑے ہو کر اپنی تیز و تند آواز میں یہ اعلان کر دیا کہ بشیرے کی موت کا ذمہ دار لالہ ہے کہ نہ وہ اسے ایسے شعر سناتا اور نہ بشیرا خودکشی پر تیار ہوتا۔ اب کیا تھا کئی زبانیں حرکت میں آ گئیں اور بزرگ اور جوان خاص طور پر عورتیں بشیرے کے خالو کی تائید کرنے لگیں۔ اس طوفان مخالفت میں چند آوازیں ایسی تھیں جو لالہ کو مجرم نہیں گردانتی تھیں مگر ان آوازوں کی طرف کوئی توجہ

نہیں دیتا تھا۔

کچھ بزرگوں نے طے کرلیا کہ لالہ کو اول تو محلے ہی سے نکل جانے پر مجبور کردیا جائے اور اگر وہ کہیں نہیں جاسکتا تو آئندہ ''یوسف زلیخا'' بالکل نہ پڑھے۔

میاں دین محمد، استاد فضل الٰہی اور دینو گویّے نے ان انتہا پسندوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن جو آگ ایک بار بھڑک اٹھی تھی اس کا مدہم ہونا مشکل تھا۔

لالہ نے اپنے بارے میں یہ فیصلہ سن لیا اور جس دن دوپہر کو اس نے فیصلہ سنا شام کے وقت اس کی دکان حسبِ معمول کھلی پڑی تھی لیکن وہ بوتلوں کے پاس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وائی مرادو کے پوتے شہاب نے بتایا کہ لالہ ''یوسف زلیخا'' اپنے ہاتھوں میں اٹھائے تحصیل بازار کی بنگالی آبادی کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس خبر کا ردعمل واضح طور پر دو صورتوں میں نکلا۔ کچھ لوگوں کو خوشی ہوئی کیونکہ انہی محلہ والوں نے لالہ کی شدید مخالفت کی تھی اور اس کے چلے جانے کو وہ اپنی فتح پر محمول کر رہے تھے۔ بعضوں کو افسوس ہوا اور دل سے افسوس ہوا۔ انہیں لالہ سے ہمدردی ہوگئی تھی اور جب یہ لوگ آپس میں گفتگو کرتے تھے تو لالہ کی حالت پر افسوس کا اظہار ضرور کرتے تھے زیادہ تعداد ان مردوں اور عورتوں کی تھی جن کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ وہ لالہ کے مخالف گروہ سے ملتے تھے تو مخالفت کرنے لگتے تھے اور جب انہیں دوسرے گروہ کے آدمیوں سے بات چیت کا موقع ملتا تھا تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے تھے۔

لالہ کے جانے کے بعد اب یہ مسئلہ پیدا ہوگیا تھا کہ دکان اور دکان کی چیزوں کا کیا کیا جائے۔ چند روز کے اندر اندر اس کا حل بھی سوچ لیا گیا۔ دکان کی چیزیں پنڈت ہرنام کے مکان کی ایک کوٹھڑی میں رکھ دی گئیں اور دکان میں افضل درزی آبیٹھا۔

❁

وقت کی گردش بدستور جاری رہی۔ محلے میں چھوٹے موٹے حادثے ہوتے رہے اور ان حادثوں کی وجہ سے لوگ بشیرے کے المیے کو بہت حد تک بھول گئے۔ مگر یہ ایک عجیب بات تھی کہ لالہ کا ذکر ہر روز کسی نہ کسی صورت میں ہو ہی جاتا تھا جو شخص بھی کسی کام سے اس کی پرانی دکان کے قریب سے گزرتا تھا تو چلتے چلتے اس کے قدم بے اختیار رک جاتے تھے اور وہ دل میں کہتا تھا:

''یہاں لالہ دنی چند بیٹھتا تھا جو یوسف زلیخا سنا کر لوگوں کو رلا دیتا تھا۔'' دوپہر کے وقت فرصت کی گھڑیوں میں جب عیسی درزی، منا راج اور دوسرے لوگ حکیم اکبر حسین کے مکان کی طرف جانے والی گلی کی نکڑ پر ایک پرانی دری بچھا کر اور اس پر بیٹھ کر تاش یا شطرنج کھیلتے تھے تو انہیں کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ محلے کی رونق میں ایک کمی واقع ہوگئی ہے اور وہ اس کمی کا احساس کر کے اداس ہو جاتے تھے۔

کہیں شادی بیاہ ہوتا تو دولہا کا باپ یہ سوچ کر غمگین ہو جاتا کہ اب اس کے ہاں یوسف زلیخا سنانے کے لیے لالہ نہیں آئے گا۔

لالہ کو وہاں سے گئے ہوئے پانچ ماہ گزر گئے تھے اور ایک روز تحصیل بازار والے راستے سے ایک اجنبی سِدّے بازار میں آنمودار ہوا۔ لمبا قد پھٹا پرانا لباس، کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز اس نے سینے سے لگا رکھی تھی۔

وہ میاں دین محمد کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ اور جب وہ انہیں ملا تو کپڑے میں لپٹی ہوئی شے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

''میاں صاحب! یہ دنی چند نے دی تھی مرنے سے پہلے اور کہا تھا۔ میں نے ساری عمر اپنے دل سے لگا کر رکھا ہے اور اب اسے اپنے محلّہ والوں کو دیتا ہوں۔ یہ میرے پیار کی نشانی ہے۔'' میاں دین محمد نے کپڑا ہٹایا تو یہ وہی ''یوسف زلیخا'' کی بوسیدہ اور ورق ورق کتاب تھی جسے لالہ دنی چند نے ہمیشہ اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھا تھا۔

اجنبی تھوڑی دیر بعد چلا گیا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب اس کا کیا کیا جائے۔

بعضوں کی رائے تھی کہ اسے کسی کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ بعض اسے دریا برد کرنے کے حق میں تھے اور بعضوں کی رائے یہ تھی کہ اسے محلے کے کسی بزرگ مثلاً میاں دین محمد ہی کے سپرد کر دیا جائے تا کہ وہ اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھیں مگر اس آخری رائے میں قباحت یہ تھی کہ دو چار اور لوگوں کو بھی محلے کے بزرگ ہونے کا دعوی تھا اور وہ اس دعوے سے دستبردار نہیں ہونا چاہتے تھے۔

باتیں ہوتی رہیں لیکن کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر اس بات پر وقتی طور پر اتفاق رائے ہو گیا کہ کتاب کو افضل درزی کی دکان میں رکھ دیا جائے اور جب کوئی متفقہ فیصلہ ہو جائے تو اسے وہاں سے

نکال لیا جائے۔

اس فیصلے پر عملدرآمد ہوگیا۔

میں جب بھی دکان کے سامنے گزرتا تو کتاب استری والی چوکی کے اوپر دیکھ لیتا تھا اور سمجھ لیتا تھا کہ ابھی اس کے بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہو سکا۔

اور ایک دن کتاب وہاں چوکی پر موجود نہیں تھی۔

میں نے سمجھ لیا کہ اہل محلہ کسی متفقہ فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ مگر یہ فیصلہ کیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔

دوسرے یا تیسرے دن میری بڑی بہن نے کہا: ''دلاور بازار سے آم کا اچار لادو۔'' میں نے چنن دین پنساری کی دکان سے ایک آنے کا اچار خریدا اور گھر کی طرف چلنے لگا۔ اثنائے راہ میں اچار والے کاغذ پر نظر پڑی تو بھونچکا سا رہ گیا۔ یہ کاغذ لالہ دنی چند والی کتاب ''یوسف زلیخا'' کا ایک پھٹا ہوا ورق تھا۔ جس کے اکثر حروف اچار کے تیل نے تباہ کر دیے تھے۔